ماریہ بتول

انسٹرکٹر، شعبۂ اردو، ورچوئل یونیورسٹی آف پاکستان، لاہور

ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں مسعود مفتی اور صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر کا تقابلی جائزہ

Abstract:

The "Fall of Dhaka", which transpired on December 16, 1971was an unforgettable moment in the history of South Asia.A lot of fictional and non-fictional literature was created on this tragedy.Masood Mufti(Minister of Education) and Siddique Salik's(as Major ISPR) non-fictional prose presents the correct perspective of political, economical, psychological, military and educational discepts regarding the Fall of Dhaka.The scribings of Masood Mufti (لمحے، ہم نفس، چہرے اور مہرے) and Siddique Salik (میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ہمہ یاراں دوزخ ،سیلوٹ) presents the correct facts about segregation through their theorems. The theories have prominent political figures (Sheikh Mujeeb, Zulfiqar Ali Bhutto, Yahya Khan and General Niazi etc). The major points of the writings are about the political strife, Desperate attempts for polical positions, poor education system, more than 90% Hindu teachers inculcate racism in Bengalis, anti national elements, unequalised behaviour of west Pakistan, militiary missests, civil war, cruelty, suurendry, imprisonment, accountability and other bras tacks.The paper presents a comparitive study of both writers theories on the above mentioned subparts of the topic.

Keywords: Fall of Dhaka, Masood Mufti, Siddique Salik, Sheikh Mujeeb, Zulfiqar Ali Bhutto, Yahya Khan, General Niazi, Civil War, Cruelty, Surrendry.

بنگلہ دیش کا قیام ،پاکستان کی تاریخ کا ایک ایسا ہولناک سانحہ ہے جس نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی جغرافیائی، سیاسی، عسکری اور معاشی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ۔مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا یہ ناقابل فراموش سانحہ جسے تاریخ میں" سقوطِ ڈھاکہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے نے ہر شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا۔ جہاں دیگر شعبے متاثر ہوئے وہیں ادب اور ادیب بھی اس کی زد میں آئے۔سقوطِ ڈھاکہ ایک ایسا سانحہ ہے کہ جس کے متعلق بہت سے ادیبوں نے اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کیا ۔ یہ اظہار کہیں ڈھکے چھپے انداز میں تو کہیں کھلم کھلا قاری کی سوچوں کے در وا کرتا ہے۔ یہاں ان شخصیات کے نظریات زیادہ قابل توجہ ہیں جو اس تاریخی سانحے کے عینی شاہدین رہے۔ اس ضمن میں مسعود مفتی اور صدیق سالک کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان دونوں شخصیات نے اپنے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ اُن حالات و واقعات کو بھی قلم بند کیا جو موجودہ دور کے قاری کو1971 ءکے سانحے کی سچائی سے روشناس کرواتے ہیں اور عسکری و قومی سطح پر نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

مسعود مفتی وزیر تعلیم کی حیثیت سے اپنے فرائض سر انجام دے رہے تھےاور صدیق سالک ISPR کے شعبے سے وابستہ تھے ۔دونوں کو عسکری امور کی انجام دہی کے سلسلے میں مشرقی پاکستان بھیجا گیا۔ سقوط ڈھاکہ پر لکھی گئی مسعود مفتی کی غیر افسانوی نثر میں لمحے، ہم نفس، چہرے اور مہرے جبکہ صدیق سالک کی نثر میں ہمہ یاراں دوزخ، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھااور سیلوٹ شامل ہیں۔ ان دونوں کی تحریریں بیان و اسلوب اور واقعات کی پیش کش کے اعتبار سے ایک حسین امتزاج ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ سیاسی، عسکری، ثقافتی، تعلیمی، معاشی و معاشرتی مسائل اور حالات کے متعلق ان دونوں کے نظریات بھی قابل توجہ ہیں۔ زیر بحث تحریر میں دونوں شخصیات کے ان نظریات کا تقابلی جائزہ لینا مقصود ہے جو پیشے کے اعتبار سے ان ادیبوں کی سوچ کو واضح کریں گے۔ یہ نظریات قاری کیلئے ایک نتیجہ خیز تجزیہ قائم کرنے میں معاون ہیں۔ کہیں اختلاف اور کہیں یکسانیت کا رنگ ان نظریات کی روشنی میں سقوطِ ڈھاکہ کے الم ناک سانحے کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرے گا۔ زمینی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئےاور اپنے پیشے کی قائم کردہ حدود میں رہتے ہوئےجہاں تک ممکن ہوا ان دونوں شخصیات نے اپنے نظریات کو درست انداز میں قوم تک پہنچانے کی کوشش کی۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے حوالے سے مسعود مفتی گہری بصیرت رکھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ پاکستان بننے کے بعد سے ہی ہماری سیاست کن ریشہ دوانیوں کا شکار رہی ہے۔ مشرقی پاکستان سے جغرافیائی دوری اور درمیان میں ازلی دشمن بھارت کی موجودگی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔جہاں سقوطِ ڈھاکہ ہمیشہ کے لئے پاکستانی عوام کی زندگی کا تاریک باب بنا وہیں ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں بے پناہ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ملک کی تاریخ کے نہ ختم ہونے والے مسائل کو مسعود مفتی نے مختصراًاس انداز میں بیان کیا ہے:

> پاکستان کی تواریخ کے تمام المیے اس ایک رویے سے پھوٹے ہیں کہ قائد اعظم کے بعد جو بھی حاکم آیا اس کا دائمی مقصد اپنا اقتدار رہا ہے۔یہ خواہشِ اول، یہی خوائشِ آخر، اِس ہوس نے برسوں ملک کا دستور نہ بننے دیا۔ بنا تو اس پر عمل نہ ہونے دیا۔ جمہوریت کو تہ تیغ کیا۔۔۔عوام کو دانستہ تعلیم سے محروم رکھا اور ایک صحت مند ملک کو بیمار جاگیر کا درجہ دے دیا۔۔۔ اتنے مختلف حاکم مگر سب کا رویہ واحد۔۔۔ حاکموں کا اگر یہ رویہ نہ ہوتا تو وطن کی تاریخ مختلف ہوتی۔ [1]

مسعود مفتی کی سیاسی بصیرت سے یہ بات پوشیدہ نہیں تھی کہ وطن عزیز نے کتنے سیاسی طوفانوں کو جھیلا تھا۔ وہ کون سے عوامل تھے جو صرف 24 برسوں میں ملک کو توڑ کر چل نکلے تھے۔ تحریک پاکستان میں جس مشرقی پاکستان کا سب سے فعال کردار رہا تھا اُس نے کیسے اپنی الگ دنیا بسائی تھی ؟دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کیسے دو لخت ہوئی تھی؟ یہ سب باتیں کسی بھی ادیب کی نگاہ سے ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔امجد اسلام امجد اس حوالے سے کہتے ہیں:

> سقوطِ ڈھاکہ ہماری تاریخ کا وہ الم ناک باب ہےجو نہ صرف ہماری نسل بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کیلئے بھی ایک مبہم تصویر کی طرح ہے جسے لوگ مزید اُلجھاتے چلے جارہے ہیں۔ مسعود مفتی ان منتخب اہلِ نظر صاحبانِ قلم میں سے ہیں جنہوں نے ان دھندلے شیشوں کو اُجالنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے۔ [2]

صدیق سالک نے اپنی غیر افسانوی نثر میں جہاں مکمل جنگی صورتحال کو بیان کیاوہیں سیاسی معاملات کے وہ پہلو بھی زیرِ بحث لائے جو پاکستان کی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ وہ اپنی سیاسی بصیرت کو عمل میں لاتے ہوئےسیاسی و عسکری حکام کےفیصلوں اور معاملات پر اپنی رائے کا اظہارکرتےہیں۔صدر یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو اور عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن کے متعلق جو بھی نظریہ قائم کیاوہ براہ راست ملاقات کی بنیاد پر کیایا ٹھوس شواہد و حقائق معلوم کرنے کے بعد کیا۔ اس سلسلے میں صدر یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو کی لاڑکانہ میں ہونے والی ملاقات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> مجھ جیسے افراد جن کا تعلق براہ راست عوامی لیگ سے تھا، نہ پی پی سے، یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسٹر بھٹو، یحییٰ خان کی میزبانی کا شرف حاصل کیے بغیر ڈھاکہ تشریف لے جاتےتو فضا اتنی مکدر نہ ہوتی۔ اس" میزبانی "کے جو اثرات ڈھاکہ میں مرتب ہورہے تھےاُن کا یا تو مسٹر بھٹو کو علم نہ تھا یا وہ جان بوجھ کر ایسی فضا قائم کرنا چاہتے تھےجس میں افہام و تفہیم کی بجائے شکوک و شبہات کوزیادہ دخل حاصل ہو۔ [3]

1971ءکی جنگ کے حوالے سے صدیق سالک کی رائے اس حوالے سے بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ ان کا تعلق افواجِ پاکستان سے تھا اور ملکی سلامتی کی راہ میں حائل رکاوٹوں میں بھی بہت سوں کا تعلق فوج سے تھا۔ یہاں چند افراد کی کوتاہی کے ضمن میں ساری فوج کومورد الزام ٹھہرانا درست نہیں ہوگا اور صدیق سالک اسی نظریے کے تحت ان عسکری حکام کو ہی مجرم گردانتے ہیں جو قصور وار تھے۔ یہاں صدیق سالک غیر ملکی مصنفین کے بیانات کی تردید بھی کرتےہیں جو ساری فوج کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> بعض غیر ملکی مصنفین کا یہ استدلال سراسر بےبنیاد ہےکہ جب صدر یحییٰ خان ایوانِ صدر میں سیاسی حل کیلئے کوشاں تھے، ڈھاکہ میں موجود جرنیلوں نے انہیں فوجی کاروائی پر مجبور کیا۔اگر بعض جرنیلوں کی طرف سے اُن پر ایسا دباؤ تھا تو یہ یحییٰ خان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والےجرنیلوں کی طرف سے ہوگا۔ڈھاکہ میں مقیم جرنیلوں کا اندازِ فکر مختلف تھا۔ [4]

صدیق سالک کا یہ انداز قصور وار اور بے قصور افسران میں ایک حد فاضل بھی قائم کرتا ہے جو قاری کو یہ سمجھانے کی کوشش تھی کہ فوجی افسران میں صرف چند لوگ ہی ذاتی مفادات کو اہمیت دے رہے تھے۔صدیق سالک نے ذاتی طور پر ان بیانات کی تردید کی ہےجو افواہوں کی صورت میں کہیں غیر ملکی تجزیہ نگاروں تو کہیں باغیوں نے عام کر رکھے تھے جو ان کی فرض شناسی کی دلیل ہے۔ہر وہ خبر جو متعلقہ یا غیر متعلقہ ذرائع سے ان تک پہنچی اس کی مکمل تصدیق اور اعداد و شمار کی درستی کے بعد اس کو قلم بند کیا گیا۔ اس سلسلےمیں اپنی رائے کچھ اس انداز میں بیان کرتےہیں:

> اگر غیر ملکی ذرائع ابلاغ عامہ نے اعداد و شمار بڑھا چڑھا کر بیان کیے ہیں تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انہیں راولپنڈی میں بیٹھے ہوئے"اربابِ عقل و دانش "نے 26 مارچ کو مشرقی پاکستان سے نکال دینے کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے اکثر صحافی کلکتہ جا کر بیٹھ گئے جہاں وہ سیاحوں کی غیر متعلقہ خبرو ں اور بھارتی حلقوں کے تخمینوں پر انحصار کرنے لگے مجھے یقین ہے کہ اگر اُن صحافیوں کو مشرقی پاکستان میں رہنے دیا جاتا، تو حالات انہیں اتنے گھمبیر نظر نہ آتے جتنے انہوں نےدور بیٹھ کر رنگ آمیزی کر کے دنیا کے سامنے پیش کیے۔ [5]

پاکستان مشرقی و مغربی پاکستان کی عوام کی مشترکہ کوششوں کا ثمر تھاجو کہنے کو تو ایک ملک تھامگر اُس کے باسیوں کی سوچ ہمیشہ سے مختلف انداز میں پروان چڑھی تھی۔ ان دونوں خطوں کی نسلیں مختلف سیاسی ماحول میں پلی بڑھی تھیں۔ مشرقی پاکستان کی عوام مغربی پاکستانیوں کی نسبت زیادہ با شعور اورملک میں پیدا ہونے والی سیاسی تبدیلیوں سے باور تھی۔اپنی شناخت کو قائم رکھنے کی فکر ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان زمینی حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئےمسعود مفتی نے بنگلہ دیش کے قیام کے دوران وہاں کے لوگوں کی نفسیات کا بہت قریب سے جائزہ لیا تھا۔مسعود مفتی لکھتے ہیں:

> مغربی پاکستان کے لوگ جاگیر دارانہ نظام تلے مسلسل پسنے کی وجہ سے عادتاًاطاعت شعار تھے اور دوسرے اُن کی کئی نسلیں فوجی ملازمت سے

روزی کماتی رہی تھیں۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں جاگیرداری نظام پیدا ہونے کی وجہ سے وہاں کے شہری خودبین، خود اعتماد، بلند بانگ اور سیاسی طور پر زیادہ بالغ نظر تھے۔[6]

اس سیاسی بالغ نظری کے باوجود مشرقی پاکستان کی عوام نے تمام حالات کا بہت ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ بہت سوں نے جنگی صورتحال میں بھی ملکی سالمیت کیلئے بہت سی اذیتیں اور تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ ان کے آباؤ اجداد اس یقین کے سہارے سب کشتیاں جلا کر پاکستان آئے تھے کہ یہی اب اُن کی کل متاعِ حیات ہے۔اُن بلند حوصلہ لوگوں میں آج بھی کچھ لوگ زندہ ہیں اور اپنے اندر کئی کہانیاں سمیٹے ہوئے ہیں ۔محمد دل شیر علی انصاری کا تعلق ایسے ہی جرات کے میناروں میں سے ہے جو آج بھی راولپنڈی کی بہاری کالونی میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ لمحات اب بھی انہیں ان گزرے دنوں کی یاد دلاتے ہیں ۔ ہمیں انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے بتایاکہ:

میں خود اپنے والدین کو بتائے بغیر فوج میں چلا گیا۔ گھر میں نہیں بتایا۔ آرمی کو ضرورت تھی۔ مکتی باہنی بار بار ہمارے گھر آتے تھے۔ وہ کہتے "تمہارا چھیلا کو تھا ئے)"تمہارا لڑکا کہاں ہے(۔ والد نے کہا مجھے نہیں پتا۔ کہتے ہم نے سنا وہ فوج میں چلا گیا ہے۔ میرا گھر دو تین دفعہ جلایا۔[7]

اس سلسلے میں صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر کا جائزہ لیں تو دیکھا جا سکتا ہے کہ ان کا تجزیہ جہاں ایک طرف بنگالیوں کی محبت کے انداز کو ظاہر کرتا ہے وہیں ان متعصب رویوں کو بھی سامنے لاتا ہےجو ملک کی سلامتی کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔جہاں ایک طرف مقامی لوگ محبت سے پیش آتے تھے وہیں مغربی پاکستانیوں کے خون کے پیاسے بھی موجود تھے۔دونوں مصنفین نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات پر قائم کیے گئے نظریات کے ساتھ ساتھ اُن نکات کو بھی واضح کیاجو دیگر لوگوں کی زبانی ان تک پہنچے تھے۔

ان تمام مسائل میں ایک بہت اہم نکتہ زبان کے جھگڑے کا بھی تھا جس نے1948ءمیں ہی سر اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔بنگالی یہ چاہتے تھے کہ ان کی زبان کو قومی حیثیت دی جائے مگر قائداعظم نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دے کر اس باب کو بند

کر دیا تھا۔ اس کو دوبارہ سے کھولنے کی کوشش کی جاتی رہی مگر معاملات اس حد تک سنگین نہیں تھے کہ صوبوں کو ہی الگ کر دیا جاتا۔اصل معاملات 1958 کے بعد آنے والے حکمرانوں کی وجہ سے تباہی کی طرف گامزن ہوئے۔اعداد و شمار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کا خطہ ہمیشہ سے استحصال کا شکار ہوتا چلا آ رہا تھا ۔اربابِ اختیار کی سیاسی چپقلش اور ناانصافیوں نے ظلم کا وہ بیج بویا جس کی فصل عوام کو کاٹنا پڑی۔

صدیق سالک کو جب مشرقی پاکستان میں تعینات کیا گیا تو وہ تمام عوامل جو ملکی سلامتی کی بقا کے لئے خطرہ تھے وہ ان سے بھی چھپے نہیں رہے تھے۔غربت کی سطح سے نچلی زندگی،نحیف و لاغر بچے و مرد، بمشکل زندگی کی گاڑی کھینچتی عورتیں اس بات کی غماز تھیں کہ دونوں خطوں کی عوام کے طرزِ زندگی میں بہت فرق ہے۔انہیں یہ بات سمجھنے میں زیادہ سوچ و بچار نہیں کرنا پڑی تھی کہ ایک ہی ملک کے وہ باسی جنہوں نے بے پناہ قربانیوں کے بعد وطن کو حاصل کیا تھاچند سالوں بعد کیوں اس نہج تک آئے تھےجہاں نوبت خانہ جنگی تک آن پہنچی تھی اور آخری ضرب لگنے میں بھی دیر نہ لگی۔ نفرت کا آغاز صرف اعلیٰ حکام کی طرف سے ہی نہیں ہوا تھابلکہ ہر محکمے میں ایسے لوگ موجود تھے جو نفرت، تعصب اور تنازعات کو ہوا دے رہے تھے۔ ہر جگہ ان سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا اور اس کی مثال دیگر مصنفین کے ہاں بھی ملتی ہے۔ اس حوالے سے کمال متین الدین اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

> مسٹر عزیز احمد جو پچاس کی دہائی کی ابتداء میں مشرقی بنگال میں چیف سیکٹری تھے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کھلی کچہریاں لگایا کرتے تھے جبکہ خود ایک مچھر دانی میں بیٹھے رہتے تھے تاکہ ہر وقت موجود رہنے والے مچھروں کے جم غفیر سے بچ سکیں۔ مشرقی بنگال میں کام کرتے ہوئےمغربی پاکستان کے بیوروکریٹس کی طرف سے ایسا رویہ خاص طور پر پنجابی اہلکاروں کے خلاف عداوت کے احساس کا موجب بنا۔ [8]

مشرقی پاکستان کا مغربی خطے سے جدا ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔بہت سے پس پردہ عناصر ملکی سلامتی کے خلاف سر گرم عمل تھے۔حکمران اس بات سے قطعی لا علم تھے کہ ان کی سیاسی چپقلش میں کوئی اور بہت رازداری سے اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے قریب ہے۔

وہ یہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ مشرقی پاکستان کی اکثریت وہ لٹریچر پڑھ رہی ہے جو کلکتہ سے چھپ کر آتاہے اور تقسیم کے بعد سے وہاں قریبا 90فیصد ہندو اساتذہ پڑھا رہے تھے۔ علیحدگی کا بیج بہت پہلے بو دیا گیا تھا۔اک نسل ملکی تعصب کو لے کر جوان ہو چکی تھی۔

مارچ 1971 میں جب مسعود مفتی کو مشرقی پاکستان بھیجا گیا تو ان کی حیثیت سیکٹری امورِ تعلیم کی تھی۔ جن جذبوں کو ساتھ لے کر اصلاح کی حیثیت سے وہ وہاں پہنچے تھے جلد ہی ان کو تھپکی دے کر سلا دیا گیا۔ دور اندیش دشمن نے جو بیج بویا تھا وہ اب ایک تن آور درخت میں تبدیل ہو چکا تھا۔مسعود مفتی نے عطاءالحق جیسے حقیقی کرداروں کی صورت میں اس خطے کے نوجوان کی نفسیاتی صورتحال بہت واضح انداز میں بیان کی۔قومیت کا زہر جس نسل کو بچپن سے پلایا گیا تھا اب وہ مغربی پاکستان کے وجود سے جلد از جلد آزادی چاہتی تھی۔ ہندو اساتذہ نے ہمارے ملک کو جس دوراہے پہ لا کھڑا کیا تھاوہاں سے ہر راستہ صرف تباہی کی طرف جاتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> اس ہوا کے رخ کے تعین میں سب سے بڑا حصہ ہندو اساتذہ کا تھا۔ اس کے بعد ان عناصر کا جو یا تو ہندوستان کے ایجنٹ تھے یا اپنے طور پر نظریہ پاکستان مین یقین نہیں رکھتے تھے۔ یہ عناصر بڑے مؤثر طریقے سے پالیسی مرتب کرنے والے اداروں میں دخیل تھے۔ [9]

مسعود مفتی کی نسبت صدیق سالک نے تعلیمی نظام پر اس طرح سے تفصیلاً بحث نہیں کی مگر بھارتی رسائل اور فلموں کے ذریعے جن پیغامات کا پرچار کیا جا رہا تھا وہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں تھا۔ اردو کے اخباراتپرتاباور ملاپ ہوں یا انگریزی کے انڈین ایکسپریس، ہندوستان ٹائمز اور ٹائمز آف انڈیا ہر جگہ اک نیا لبادہ اوڑھ کر بھارت اس انسان دوستی کا پرچار کرتا رہا کہ ہندو مسلم سب برابر ہیں۔ جب کہ قائد نے بہت پہلے ہی دو قومی نظریے کے ذریعے ایک حد بندی کر دی تھی۔سقوط کے بعد بھی حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کیا جاتا رہا۔ایسے میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ جس نسل کو بچپن سے قومیت پرستی پڑھائی جا رہی تھی وہ کیسے علیحدگی کی طرف مائل نہ ہوتی۔ سر میلا بوس اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

بنگالی ڈراموں میں پاکستانیوں کو ولن اور بنگالیوں کو مظلومیت کی تصویر دکھایا جاتا رہا اور اس ڈرامائی تشکیل میں حقائق کو بڑی حد تک مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ تمام اطراف سے آنے والا مواد حیرت انگیز حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ [10]

شکست کی دیگر وجوہات کے ساتھ ساتھ ہماری تاریخ کے اوراق میں چند ایسی قابلِ ذکر شخصیات کانام ملتاہے جنہوں نے ملکی جغرافیہ تبدیل کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ صدر آغا محمد یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو، مجیب الرحمٰن اور ایسٹرن کمانڈر امیر عبداللہ خان نیازی ان میں سرِ فہرست ہیں۔ مغربی پاکستان پر قابض رہنے کی خواہش نے یحییٰ خان اور بھٹو کو اور مشرقی پاکستان پر مسلط رہنے کی ہوس نے مجیب الرحمٰن کو ملکی بقا سے ماورا کر دیا تھا۔ایسے میں حالات اس قدر نازک موڑ اختیار کر چکے تھے کہ مسعود مفتی کو لگتا ہے کہ فوجی ایکشن لازم تھاا ور یوں ان قابلِ ذکر لوگوں نے سقوط کا کلک تمام عمر کے لئے قوم کے ماتھے پہ سجا دیا۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک نے اپنے حالت و واقعات کو سامنے رکھتے ہوئےاپنی آرا کو پیش کیا۔

صدیق سالک جو سقوطِ مشرقی پاکستان کے وقت کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے ایسے بہت سے واقعات کے شاہد تھے جن کا تعلق جنگی و سیاسی صورتحال سے تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے مرکزی کرداروں کے متعلق اپنا بے لاگ تبصرہ پیش کرتے ہوئے کہتےہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں سیاستدانوں اور جرنیلوں نے مل کر جتنا فساد بپا کیا وہ ہماری تنزلی کے لئے کافی تھا۔ ملکی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ جرنیلوں نے جہاں سیاستدان کی حیثیت سے مداخلت کی اس کا نتیجہ درست نہیں نکلا۔ جنرل یحییٰ خان ملکی حالات کو سنبھالا دینے کی بجائے جس انداز میں بگاڑتے گئے اس کے بعد کی صورتحال خود ان کے اپنے قابو سے باہر تھی۔

مجیب الرحمٰن کا کردار بھی ان کے مشاہدات و تجربات سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ وہ مجیب الرحمٰن کی دوغلی شخصیت سے واقف تھے۔موقع کی مناسبت سے قلابازی کھانا مجیب الرحمٰن کا شیوہ تھا ۔ یہاں تک کہ علیحدگی کے بعد بھی اس سانحے کی تمام تر ذمہ داری مغربی پاکستان کے حصے میں ڈال کر شیخ مجیب بری الذمہ ہو گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگلہ دیش کا صدر بننے

کے بعد بی بی سی کے شہرت یافتہ ڈیوڈ فراسٹ کو انٹرویو دیا ۔ ایک سوال کے جواب میں شیخ مجیب نے یحییٰ خان کے متعلق اس طرح سے رائے کا اظہار کیا:

> وہ یقیناً خود سے شیطان تھا اور اس کے دوست بھی شیطان تھے۔ یحییٰ خان ان سب کاموں کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر بری الذمہ نہیں ہو سکتا وہ مکمل طور پر ایک مکروہ انسان تھا11 ؎

اس سانحے کا ایک اور مرکزی کردار جنرل نیازی تھے جو عسکری ناکامی کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ وہ اعلیٰ عسکری و اخلاقی کرداری خوبیاں جو کسی بھی جرنل کا خاصہ ہو سکتی ہیں جنرل نیازی میں مفقود تھیں ۔ وہ جو مغربی صحافیوں کے سامنے کہتے تھے کہ بھارتی فوجیں ان کے سینے پر سے ٹینک گزار کر ڈھاکہ میں داخل ہوں گی انہوں نے کئی ہزار فوجیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔تاریخ خود پر ہوئے ظلم معاف نہیں کیا کرتی۔ جنرل نیازی کے حوالے سے حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ میں درج ہے کہ:

> ڈھاکہ ایئر پورٹ پر فاتح بھارتی افواج کے جنرل اروڑہ کا ستقبال اور اسے "گارڈ آف آنر "کی پیش کش ، اور اس کے بعد ریس کورس میں منعقد ہونے والی ہتھیار ڈالنے کی عوامی تقریب میں ان کی شرکت ایسے واقعات ہیں جنہوں نے پاکستان اور اس کی مسلح افواج کے سر ہمیشہ کے لئے شرم سے جھکا دیئے ہیں ۔ 12؎

اس ساری سیاسی چپقلش کا انجام نہایت بھیانک انداز میں تاریخ کے اوراق پر رقم ہے۔خانہ جنگی کے دوران مکتی باہنی نے وہ فسادات بپا کئے جن کی مثال نہیں ملتی ہے۔ بنگالی ایک ایسی قوم کی صورت میں اُبھرے تھے جنہوں نے غیر بنگالیوں ، بہاریوں اور مغربی پاکستانیوں کو ہر طرح سے موت کے گھاٹ اتارا۔مسعود مفتی کو جن عینی شاہدین نے اپنے غم کی داستان سنائی اس میں ذبح کیا جانا ، عصمت دری کے واقعات ، گولیوں سے بھون دیا جانا، ڈرپ کے ذریعے جسم سے خون کھینچ لینا اور ایسے بہت سے بے دردی کے مظاہرے شامل تھے ۔ڈھاکہ کی ویران سڑکیں، اُجڑے گھر، کُھلے کِواڑاِس بات کے غماز تھے کہ بنگالی قو میت کے نام پر جس بربریت کا مظاہرہ کیا گیا اس کی جذباتی و نفسیاتی جڑیں کہیں اور تھیں۔

جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر اپنا کردار ادا کیا تھا وہی پاکستان بننے کو ایک غلطی تصور کرنے لگے تھے۔کیا ہم بحیثیت قوم کبھی ایک بن ہی نہیں پائے تھے؟کیا یہ ہمارا قومی رویہ تھا یا پھر مخصوص وقت میں پیدا ہونے والی کوئی نفسیاتی کیفیت تھی؟اتنے تشدد کے باوجود بھی خود کو مظلوم اور قابلِ رحم حالت میں پیش کرنا ایک ایسا رویہ تھا جس کی بنیاد میں صوبائی وقومی،لسانی وتہذیبی تعصب شامل تھا۔مسود مفتی بحیثیت سیکٹری تعلیم یہ سمجھ چکے تھے کہ قلم کا زہر نسلوں میں منتقل ہو چکا تھا۔ظلم کی جو داستانیں رقم کی گئی تھیں ان کی گواہی خود بنگالی مصنفین کی کتابوں میں بھی ملتی ہے۔ سرمیلا بوس نے اپنی کتاب کے سلسلے میں جوانٹرویو کئے ان کے مطابق:

> عورتوں ، مردوں اور بچوں کو چھریوں سے ، گولیاں مار کر ہر ممکن طریقے سے قتل کیا جا رہا تھا۔ لاشوں کو دریا برد کر دیا گیا ۔ بہاریوں کے مطابق بنگالیوں نے" پھانسی گھاٹ "مقتل قائم کر رکھے تھے جہاں وہ بہاریوں کو ہلاک کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ کمرے میں موجود تمام افراد نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔۔۔ جیسا کہ بنگالی خود اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے ہزاروں افراد کو قتل کیا ۔ [13]

نظریاتی بنیاد پر قائم کئے جانے والا ملک جب ٹوٹا تو اس سے ہماری نظریاتی اساس کو شدید دھچکا لگا۔ایسے میں صدیق سالک کی تحریریں جہاں ہمیں مظالم و اموات کی شرح سے آگاہ کرتی ہیں وہیں ان کے نظریات ایک فوجی کی حیثیت سے علیحدگی کی وجوہات کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔کشتیا، جیسور ،کھلنا ،چٹاگانگ ،کومیلا اور ایسے بہت سے علاقے جہاں افواج پاکستان کو آپریشن کرنے اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا تھا ان کا احوال صدیق سالک کی تحریر کا حصہ ہے ۔ان کی نگاہ سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ اربابِ اختیار سے حالات کو سنبھالا نہ گیا تو فوج کو بلایا گیامگر پھر مجیب الرحمٰن کی پرزور حمایت پر فوج کو بیرکوں میں واپس بھیج دیا گیا۔اس کے بعد غیر بنگالیوں نے ظلم کی وہ داستانیں رقم کیں جن کی مثال نہیں ملتی ہے۔فوج نے حتٰی الامکان ڈسپلن کو برقرار رکھامگر ان کے سامنے ان کے اہلِ خانہ کو ذبح کیا گیا، خواتین کی عصمت دری کی گئی تو ایسے میں بہت سے افسران اپنا ذہنی توازن بھی کھو بیٹھے۔

بنگالی قوم کے لئے مجیب الرحمٰن اتنی سفاکیت کے بعد بھی ہیرو تھا۔وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان کے اقدام متحدہ پاکستان کی سالمیت کو داؤ پر لگا چکے ہیں ۔ان حالات میں ملک کامتحد رہنا کسی دیوانے کا خواب تھا ۔اس ظلم کے ساتھ ایک اور ظلم یہ ہوا کہ بین الاقوامی سطح پر ہر جگہ فوج کوموردِالزام ٹھہرایا جا رہا تھا اور ایسے میں حکومت کی خاموشی قابلِ غور و قابلِ مذمت تھی۔اخبارات اور ریڈیو جس قدر ان مظالم کی خبروں کو چھپاتے رہے اس قدر ہماری قومی و بین الاقوامی حیثیت کمزور ہوتی گئ ۔اگر درست انداز میں بر وقت تمام مظالم سے عالمی دنیا کو آگاہ کرایا جاتا تو مغربی پاکستان کا کردار کبھی بھی اس قدر مشکوک نہ ہوتا ۔صدیق سالک بھی پاکستان کے کردار کے حوالے سے عالمی دنیا کی رائے سے بے خبر نہیں تھے ۔صدیق سالک اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> جو قیامت غیر بنگالیوں پر ٹوٹی ،اس کا نوحہ نہ سرکاری اعلامیوں میں درج ہوا نہ اخبارات میں ۔ان کا خون ان کی آہوں کی طرح بےاثر گیا ۔ مجھ سمیت کئی لوگوں نےحکام بالا سے کہا کہ عوامی لیگ کے دورِ حکومت میں ہونے والے ان مظالم کی تفصیلات چھپنی چاہیں ۔مگروہ نہ مانے ۔ان کا اقرار یہ تھا کہ یہ دلخراش واقعات پر دہ راز میں ہی رہنے چاہیں ۔ [14]

دفاعی کے ساتھ ساتھ نظریاتی شکست بھی ہمارےحصے میں آئی جہاں ہم آج تک خود کوثابت نہیں کر سکے ہیں۔خانہ جنگی کے بعد سے سول سروسز کے ملازمین اورافواجِ پاکستان کے سپاہی و افسران کو بھارتی قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک دونوں نے اس نفسیاتی عذاب کو بھی جھیلا اور قلم بند کیا جو ان کے ساتھ ساتھ بہت سے دیگر سپاہیوں کو بھی جھیلنا پڑا تھا۔دورانِ قید ہندوستانیوں کا پڑھایا جانے والا انسان دوستی کا سبق اور دوقومی نظریے کی مخالفت ایک الگ طرح کی ذہنی اذیت تھی۔اس کے ساتھ یہ خیال بھی دامن گیر تھا کہ کاش اس مسئلے کا کوئی سیاسی حل نکال لیا جاتا یا وہ لمحہ جب فوجی ایکشن سے حالات پر قابو پا لیا گیا تھا اس وقت مل بیٹھ کر کوئی درمیانی راہ نکال لی جاتی۔مسعود مفتی کا احتسابی رویہ بحیثیت پاکستانی اور مسلمان ہمیں قرآن کی روشنی میں اپنا اصل چہرہ دکھاتا ہے ۔بحیثیت قوم ہم نے جو کچھ اس ملک کو دیا ہمیں وہی لوٹایا گیا۔مسعود مفتی کہتے ہیں:

جو کچھ ہماری قوم کے ساتھ ہوا ہے ۔ وہ وہی ہے جو ہونا چاہیے تھا ۔بلکہ یہ بھی خدائے تعالیٰ کا کرم ہے کہ کم ہوا ۔ ورنہ ریاضی کے ان فارمولوں کے مطابق تو بہت زیادہ ہو سکتا تھا ۔ [15]

مسعود مفتی نے جہاں قوم کو احتساب کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا وہیں تصویر کا دوسرا رخ پیش کرتے ہوئے صدیق سالک فوج کو لے کر پُر اُمید تھے اور اس کا مستقبل بہت روشن دیکھ رہے تھے۔جب کہ خانہ جنگی کے بعد جب حالات و واقعات کی پڑتال کی گئی اور حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ شائع کی گئی تو اربابِ اختیار کی سنگین غلطیوں کی طویل فہرست تیار ہوئی۔ تمام عسکری و سیاسی کردار بے نقاب کر دیئے گئے۔اس سب کے باوجود ہم بحیثیت قوم 1971 سے بھی بہت پیچھے چلے گئے ہیں۔ پاکستان بنے اور ٹوٹے کئی سال بیت گئے مگر کوئی قابلِ ذکر تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ ہمارے انفرادی و اجتماعی رویے آج بھی بے راہ روی کا شکار ہیں۔

مسعود مفتی اور صدیق سالک کے نظریات کا مجموعی جائزہ لیں تو سقوطِ ڈھاکہ کے ابتدائی محرکات سے لے کر احتساب تک ہر پہلو کو زیرِ بحث لایا گیا۔ عینی شاہدین کی حیثیت سے ان کے نظریات جو کہ سیاسی چپقلش، کرسی کی کھینچا تانی، بوگس تعلیمی نظام، بنگالیوں کی قوم پرستی، ملک دشمن عناصر کی چال بازیاں، مغربی پاکستان کی طرف سے روا رکھا گیا غیر مساوی رویہ، عسکری حکام کی کوتاہیاں، خانہ جنگی اور ظلم و بربریت کے واقعات، ہندوستانی افواج کے آگے ہتھیار ڈالنا، قید و بند اور پھر قومی احتساب سے متعلق تھے اپنی ایک ادبی و تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ دونوں شخصیات کی نظریاتی وابستگی قاری کے ذہن میں موجود سقوطِ ڈھاکہ کی گتھیاں سلجھانے میں معاون ہے۔ گو کہ اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کی سچائیوں کو ہمیشہ توڑ موڑ کر پیش کیا جاتا رہا اور بہت سی حقیقتیں آج بھی پوشیدہ ہیں مگر اس سیاہ باب سے متعلق مسعود مفتی اور صدیق سالک کی تحریریں ہر دور کے محقق کو اس عظیم المیے کے تلخ نظریاتی حقائق مہیا کرتی رہیں گی۔

حوالہ جات

1۔ مسعود مفتی، ہم نفس،(لاہور :فیروز سنز،1996ء)، ص51،52۔

2۔ مقصودہ حسین ،ڈاکٹر، مسعود مفتی :شخصیت اور فن، (اسلام آباد :اکادمی ادبیات پاکستان،2008 ء)، ص176 ۔

3۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، (لاہور:الفیصل پرنٹرز ،2017 ء)، ص51۔

4۔ ایضاً،ص88۔

5۔ ایضاً،ص122۔

6۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے،(اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،2014 ء)، ص103۔

7۔ محمد دل شیر علی انصاری، راقمہ سے براہ راست انٹرویو،(بہاری کالونی راولپنڈی 8 :دسمبر 2019ء)،دوپہر1:15 ۔

8۔ کمال متین الدین، نسلوں نے سزا پائی بحران ڈھاکہ1971-1968، (Tragedy of Errors:East Pakistan Crisis 1968-1971)،مترجم ڈاکٹر محمد شیراز دستی،(لاہور:عکس پبلی کیشنز،2018ء)، ص41۔

9۔ مسعود مفتی ، ہم نفس،(لاہور :فیروز سنز1996ء)،ص89 ۔

10۔ سرمیلا بوس، ڈھاکہ کہانی کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی (Dead Reckoning Memories of the1971 Bangladesh War)، مترجم نذر حسین کاظمی(لاہور:اظہار پرنٹرز،2013 ء)، ص6۔

11۔ طارق اسماعیل ساگر، حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ آخری سگنل کی کہانی،(لاہور : ساگر پبلی کیشنز،2015ء) ص127۔

12۔ محمد اشفاق خان، سید فضیل ہاشمی(مترجمین)، حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ،(لاہور :طیب شمشاد پرنٹرز،2018 ء)، ص426 ،427۔

13۔ سرمیلا بوس، ڈھاکہ کہانی کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی (Dead Reckoning Memories of the 1971 Bangladesh War)، مترجم نذر حسین کاظمی(لاہور:اظہار پرنٹرز،2013 ء)، ص102 ۔

14۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، (لاہور:الفیصل پرنٹرز ، 2017ء)،ص81۔

15۔ مسعود مفتی، لمحے، (اسلام آباد :دوست پبلی کیشنز،2012 ء) ،ص126 ۔